بابائے اردو

مولوی عبدالحق

اور

میوات

از

ڈاکٹر مفتی محمد مشتاق تجاروی

مطبوعہ

ہفت روزہ ہماری زبان دہلی

قسط اول جلد 78 شمارہ 35 بابت 15 ستمبر 2019

قسط دوم جلد 78 شمارہ 36 بابت 22 ستمبر 2019

موبائل/وٹس ایپ:03314894305

توصیف الحسن خان میواتی الھندی

(بھنگوہ-میوات-بھارت)

موبائل/وٹس ایپ:9813267552

پہلی قسط

بابائے اُردو مولوی عبدالحق اور میوات

مشتاق احمد تجاروی

بابائے اردو مولوی عبدالحق (1961-1870) اردو زبان کے عاشق بھی تھے اور خادم بھی۔ انھوں نے ساری عمر اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں گزاردی۔ اردو زبان ان کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ انھوں نے اردو میں علمی تحقیق و ترجمے کے متعدد کام خود بھی کیے اور دوسرے دانشوروں کو بھی اس کام میں لگایا، اردو کی کلاسکی کتابوں کو شائع کیا، اردو زبان کی تاریخ اور اس کی لسانیاتی تشکیل کے سوتے تلاش کرنے کی کوشش کی۔ ان کو اردو سے متعلق کوئی نئی بات یا نیا سلسلہ مل جاتا تو اس کی تلاش میں خود بھی سفر کرتے اور اپنے احباب کو بھی اس کی جانب متوجہ کرتے۔

بابائے اردو کی زندگی کا ایک پہلو میوات اور میواتی زبان سے متعلق ان کی خدمات ہیں۔ یہ بڑی غیر معمولی بات ہے کہ اردو دنیا کی سب سے مقتدر ہستی اپنے آرام و راحت کو تج کر میوات کے دیہاتوں میں جائے اور دیہاتی زبان کو سنے، لکھے اور اس کی تدوین و اشاعت کی کوشش کرے، اس کے بارے میں لوگوں کو توجہ دلائے اور کم و بیش ایک دہائی تک یہ کوشش ان کی فکر کا موضوع رہی، لیکن افسوس ان کی زندگی کا یہ پہلو سامنے نہیں آسکا اور نہ ان کی سوانح میں جگہ پاسکا۔ ان کی زندگی کے اس پہلو کا تذکرہ ان کے خطوط میں موجود ہے اور کسی قدر مختلف لوگوں کی یادداشتوں، نیز ماہنامہ 'معارف' اعظم گڑھ کے بعض مضامین اور بعض اخبارات کی خبروں پر منحصر ہے۔ ذیل میں ان معلومات کو ایک تمہید کے ساتھ یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اردو کی لسانی تشکیل اور میواتی زبان

اردو زبان کی لسانیاتی تشکیل کا سوال جتنا مشکل آج ہے مولوی عبدالحق کے زمانے میں بھی اتنا ہی مشکل تھا۔ حتمی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اردو زبان کیسے وجود میں آئی۔ اردو کا آغاز ہندستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد ہوا لیکن اپنے مزاج اور اپنے قواعدِ صرف ونحو کے اعتبار سے اردو خالص ہندستانی زبان ہے۔ البتہ یہ طے نہیں ہے کہ ہندستان کی وہ کون سی زبان ہے جس کے اشتراک سے اردو زبان کی منفرد لسانی تشکیل ہوئی۔ مختلف لوگوں نے مختلف نظریات پیش کیے ہیں۔ اصحابِ تحقیق نے جن زبانوں اور بولیوں کا نام اردو کی تشکیل کے لیے لیا ہے ان میں ایک میواتی زبان بھی شامل ہے۔ پروفیسر مسعود حسین خاں اور ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ نے اس کو تسلیم کیا ہے کہ اردو کی لسانیاتی تشکیل میں میواتی زبان کا بھی اہم کردار ہے۔ پروفیسر مسعود حسین خان نے اپنی کتاب 'مقدمہ تاریخ زبانِ اردو' میں لکھا ہے:

> ''میواتی: یہ الور دہلی کے جنوب میں گوڑگاواں میں بولی جاتی ہے۔ قدیم اردو کی ساخت پرداخت میں اس کا بھی حصہ رہا ہے۔ حالاں کہ اس پر تحقیق کم ہوئی ہے کیوں کہ ادبی اعتبار سے یہ بولی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔'' [1]

ایک اور مقام پر لکھا ہے کہ

> ''شمال میں گوڑگانواں کے ضلع میں اس (برج) پر میواتی کا اثر دکھائی دیتا ہے۔'' [2]

ایک اور مقام پر غالباً کہنا یہ چاہتے تھے کہ اردو زبان میواتی سے بنی ہے لیکن میدانِ تحقیق کے پائے نازک نے وادیِ پُرخار کی دہلیز سے پہلے ہی اپنا رخ موڑلیا۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''شہر دہلی کے جغرافیائی محل پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ یہ شہر برج بھاشا، ہریانی، کھڑی بولی اور میواتی (راجستھانی کی ایک بولی) کے سنگم پر واقع ہے۔ راجپوتوں کی دلی، ڈلی یا اپ بھرنش ادبیات کی ڈھلی ہریانہ کے علاقے میں تھی جس سے کھڑی بولی کی بہ نسبت میواتی زیادہ قریب تھی۔'' [3]

پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ نے بھی اپنی کتاب 'اردو کی لسانی تشکیل' میں صفحہ 20، 54 اور 141 وغیرہ متعدد صفحات پر اس بات کا تذکرہ کیا ہے کہ اردو کی لسانیاتی تشکیل میں میواتی کا بھی حصہ ہے۔ [4]

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے بھی بہ ظاہر اسی سلسلے کی کڑیاں تلاش کرنے کے لیے میوات کے سفر کیے تھے۔ دراصل میوات کا خطہ دہلی کے اطراف میں ہلالی انداز میں بسا ہوا ہے۔ خود شہر دہلی کا ایک حصہ میوات میں شامل رہا ہے جیسے مہرولی، بیگم پور، چھتر پور، حوض رانی اور قرول باغ وغیرہ۔ دہلی کے تمام حکمرانوں کا بھی اس علاقے سے خاص تعلق رہا ہے۔ عہدِ سلطنت میں میوات کے لوگ دہلی سلطنت میں بڑا اثر ورسوخ رکھتے تھے، 'تاریخِ مبارک شاہی' اور دوسری کتابوں میں اس کے اشارے موجود ہیں۔ دہلی کے بعض حکمراں بادشاہ بننے سے پہلے میوات میں ہی رہتے تھے، جیسے سیّد مبارک شاہ جب بادشاہ بنا تو اس کو میوات سے بلا کر تخت نشین کیا گیا تھا۔ میوات کے بعض رئیسوں جیسے راجہ علاول خاں میواتی اور راجہ حسن خاں میواتی کی دہلی کے شاہی گھرانے میں رشتے داریاں بھی تھیں۔

مغل عہد میں بھی میواتیوں کا یہ سلسلہ قائم رہا۔ بیرم خاں کی بیوی میوات کی تھی اسی کے بطن سے عبدالرحیم خانخاناں پیدا ہوئے۔ ہمایوں کی بھی ایک بیوی میوات کی تھی، طبقات اکبری میں اس کا تذکرہ ہے۔ ان باتوں کے علاوہ میوات کی اکثریت آبادی مذہباً مسلمان ہے۔ ان کا عربی و فارسی کے الفاظ اور اسلامی روایات کو اپنی زبان کا حصہ بنالینا ان کی ضرورت بھی تھی اور ان کے لیے آسان بھی تھا چناں چہ میواتی زبان میں عربی فارسی کے بہت سے الفاظ ہیں اور ایسے الفاظ بھی بہ کثرت ہیں جو کثرتِ استعمال سے اپنی اصل ہیئت بھی کھو چکے ہیں جیسے میوات میں قبرستان کو ہدیرہ کہا جاتا ہے جو عربی زبان کے لفظ حضیرہ کی بگڑی ہوئی شکل ہے، اسی طرح میواتی زبان کا ایک لفظ جانکدنی دراصل فارسی لفظ جان کنی ہے وغیرہ۔ ان سب شواہد کے ساتھ میواتی زبان کا لب ولہجہ اردو کے بہت قریب ہے اور میوات میں اس کا چلن بھی ہے۔ آج بھی میوات میں تقریبات یا جلسوں یا تحریر کے لیے میواتی زبان کا استعمال نہیں ہوتا بلکہ اردو ہی استعمال کی جاتی ہے، اس لیے یہ کہنا بعید نہ ہوگا کہ فطری اور منطقی طور پر اردو کی صورت گری میواتی زبان کے زیر اثر ہوئی ہوگی جس کا اثبات پروفیسر مسعود حسین خاں اور ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ وغیرہ نے کیا ہے۔

میواتی زبان کے ساتھ سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ اس زبان کا ادب یا اس کی شاعری زبانی روایات پر مبنی ہے، تحریری طور پر دستیاب نہیں ہے۔[5] پروفیسر مسعود حسین خاں نے اپنی کتاب 'مقدمہ تاریخ زبان اردو' میں بھی اس مشکل کا اظہار کیا ہے اور ایک مرتبہ راقم الحروف کے ساتھ ایک ذاتی ملاقات میں اس پر اظہارِ افسوس کیا تھا کہ میواتی زبان کے نمونے دستیاب نہیں ہوتے، اس لیے اس زبان کے بارے میں حتمی رائے دینا مشکل ہے۔

بابائے اردو کا پہلا سفرِ میوات

بابائے اردو مولوی عبدالحق میواتی زبان اور اس کی ادبیات خاص طور پر اس کی شاعری کو ضبطِ تحریر میں لانا اور اس کو شائع کرنا چاہتے تھے۔ اس کام کے لیے انھوں نے باضابطہ میوات کے کم از کم تین سفر کیے، وہاں مختلف شہروں، قصبوں اور گاؤوں میں گئے، لوگوں سے ملاقاتیں کیں، وہاں کے شاعروں، ادیبوں اور شعر و ادب کا فہم رکھنے والوں سے ملے، وہاں جو میراثی، گوئیے اور بھاٹ وغیرہ ہوتے ہیں ان سے بھی ملے اور ان کی روایتی موسیقی کے ساتھ ان کا کلام سنا اور میواتی زبان کی شاعری کو لکھنے کا بھی انتظام کیا تاکہ اس کا ادبی سرمایہ تحریری طور پر شائع کیا جاسکے۔ بابائے اردو کی کسی سوانح یا ان کے تذکرے میں ان کے کسی سفرِ میوات کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس کا تذکرہ جلیل قدوائی کے مرتب کردہ 'مکتوباتِ عبدالحق' میں تین مختلف مقامات پر آیا ہے اور ضمنی طور پر مختلف تذکروں اور یادداشتوں میں، جس کو مرتب نہیں کیا گیا۔

مولوی عبدالحق کے خطوط میں واضح طور پر یہ تذکرہ ہے کہ انھوں نے میوات کے دو سفر کیے لیکن دیگر ذرائع سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ متعدد بار میوات گئے اس کی تفصیل اس مضمون میں آرہی ہے۔ انھوں نے میوات کا پہلا سفر 26 دسمبر 1931 میں کیا تھا۔ اس سفر سے واپسی پر 8 جنوری 1932 کو جناب عبدالستار صدیقی کے نام ایک خط میں اجمالاً اس کا تذکرہ کیا ہے۔ اس خط کی تاریخی اہمیت اور دلچسپی کے لیے یہ پورا خط ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

> ''ہاپوڑ، ۸ جنوری ۱۹۳۲ء
> محبی زاد لطفہٗ ... تسلیم
> میں میوات کے دورے سے واپس آکر علی گڑھ چلا گیا تھا۔ آج ہی وہاں سے آیا ہوں اور اب دہلی جارہا ہوں۔ آپ کا خط مع کاغذات لغت دورانِ سفر ہی میں ملا۔ شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ میرے ساتھ میوات چلنے پر آمادہ ہو جائیں گے ورنہ ضرور آپ کو لے چلتا۔ میوات ہمارے لیے نئی دنیا ہے۔ یہ سفر بہت ہی دلچسپ تھا۔ میں نے دیہات کا سفر کیا اور وہاں کے بھاٹوں اور مراثیوں سے میووں کے قدیم گیت اور نظمیں سنیں اور ان کے قلم بند کرنے کا بھی انتظام کرلیا ہے۔ یہ چیزیں ان کے خاص راگوں میں سننے کے قابل تھیں۔ میں ان شاء اللہ ان کو شائع بھی کروں گا'' [6]

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اس خط سے قبل مورخہ 24 دسمبر 1931 کو عبدالستار صدیقی کے نام ایک خط میں اس کا تذکرہ کیا تھا کہ میں میوات جارہا ہوں۔ لکھا تھا:

> ''میں پرسوں یہاں سے میوات جانے کا ارادہ کررہا ہوں اور کچھ دن اس علاقے میں بسر کروں گا۔ وہ مقام اور وہاں کے لوگ دیکھنے کے قابل ہیں''۔ [7]

غالباً عبدالستار صدیقی بھی میوات جانا چاہتے تھے اور انھوں نے شکایت کی کہ مولوی عبدالحق ان کو اپنے ہمراہ نہیں لے گئے۔ اس کا تذکرہ 8 جنوری کے خط میں گزر چکا ہے۔

بابائے اردو اور سیّد مطلبی فرید آبادی

بابائے اردو مولوی عبدالحق کے خط میں متعدد اہم باتیں ہیں۔ خاص طور پر یہ بات بہت اہم ہے کہ وہ میوات کے گیتوں اور نظموں کو شائع کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے ان کو نقل کرنے کا بھی انتظام کیا تھا بلکہ اس کا آغاز بھی خود کیا تھا اور میواتی شعر و ادب کے کچھ نمونے خود جمع

کیے تھے جیسا کہ مختلف شواہد سے آگے آرہا ہے اور اس ذخیرے کو ایک محقق اور بڑے عالم سیّد ہاشمی فریدآبادی اور چودھری کنول خاں کے مشورے سے ان کے چھوٹے بھائی سیّد مطلبی فریدآبادی کے سپرد کیا تھا اور ان کو ذمے داری دی تھی کہ وہ اس کام کو پورا کریں۔ اس کام کے لیے چودھری یاسین خاں کے مشورے سے سیّد مطلبی کے لیے معاوضے کا بھی انتظام کیا تھا اور یہ معاوضہ الور کی میو پنچایت کو ادا کرنا طے پایا تھا، اس کی وضاحت مولانا کمال سالارپوری نے ایک مقام پر کی ہے، اس کا حوالہ آگے آرہا ہے۔ سیّد مطلبی خود بھی بڑے عالم فاضل اور بہترین شاعر تھے، انھوں نے یہ کام بڑی محنت سے انجام دیا بلکہ اس کام میں پوری طرح رچ بس گئے حتیٰ کہ خود بھی میواتی میں شاعری کرنے لگے۔ انھوں نے میوات کے بہت سے قدیم شعرا اور بہت سے معاصر شعرا کا کلام جمع کیا۔ میواتی شعرا کے کلام کی تدوین سے متعلق انھوں نے اپنے ایک خط میں ساغر نظامی کو لکھا ہے کہ: ''مدت سے میرٹھ آنے کا ارادہ ہے، مگر کیا کریں بھائی۔ دیہاتی شعرا کا نظام مرتب کرو، بھرت پور، الور میں ہنگامہ آرائی کرو''۔[8] ایک اور خط میں ساغر نظامی کو ہی لکھا ہے کہ: ''میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ آپ کو ایک مضمون میواتی شاعروں کے منتخب کلام کے سلسلے میں بھیجوں گا اس وعدہ کے ایفا کی نوبت نہیں آئی''۔[9]

سیّد مطلبی نے میواتی ادب کے تعارف پر مضامین بھی لکھے۔ ساغر نظامی سے وعدہ کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اس کے علاوہ ان کا ایک مضمون جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ترجمان مجلّہ ''جامعہ'' کی جلد 28 کے شمارہ 2 اور 3 بابت 1937 میں دو قسطوں میں شائع ہوا۔[10] اس مضمون میں انھوں نے چند میواتی شعرا کے کچھ اشعار بھی نقل کیے ہیں۔ انھوں نے بعض سمیناروں میں بھی اس موضوع پر مقالات پیش کیے۔

باباے اردو کا دوسرا سفرِ میوات

میواتی شاعری سے سیّد مطلبی کی دل چسپی بہ طورِ جملۂ معترضہ آگئی، اصل سلسلۂ کلام یہ ہے کہ مولوی عبدالحق نے سیّد مطلبی کو میواتی شاعری جمع کرنے پر مامور کیا اور وقتاً فوقتاً اس کام کی پیش رفت کے بارے میں خبر بھی لیتے رہتے تھے۔ کئی سال کے بعد یہ کام مکمل ہوا تو مولوی عبدالحق نے دوبارہ میوات جانے کا ارادہ کیا۔ سیّد مطلبی کے بڑے بھائی سیّد ہاشمی فریدآبادی کے نام 25 مارچ 1938 کو ایک خط میں لکھا:

> ''غنیمت ہے کہ مطلبی کو اپنا وعدہ یاد ہے بلکہ اس کے وفا کرنے کا بھی سامان انھوں نے کر رکھا ہے۔ اگر یہ ہے تو مجھے میوات جانے اور وہاں رہنے میں تامّل نہیں۔ وہاں کے لیے جاڑے ہی کا موسم مناسب معلوم ہوتا ہے۔ یہ بھی پوچھ لو۔''[11]

اس خط سے واضح طور پر اندازہ ہوتا ہے کہ باباے اردو، سیّد مطلبی سے کام کی پیش رفت کے بارے میں معلومات کرتے رہے تھے اور وہ کوشش میں تھے کہ یہ کام مکمل ہو جائے تو میوات کا سفر کریں۔ چناں چہ ان کو جیسے ہی یہ اطلاع ملی کہ کام ایک حد تک مکمل ہو گیا ہے تو انھوں نے میوات جانے کا ارادہ کر لیا۔

باباے اردو کے اس دوسرے سفرِ میوات کے بارے میں کسی قدر جزوی معلومات جناب آئی اے رحمٰن کی یادداشتوں سے ملتی ہیں انھوں نے اپنی بچپن کی یادداشتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''دوسرا واقعہ پلول میں مولوی عبدالحق کی آمد سے متعلق تھا، وہ پلول کیوں آئے تھے یاد نہیں ان کا قیام میر صاحب (سیّد مطلبی) کے بھتیجے سیّد علی اختر کے یہاں ہوا۔ مولوی عبدالحق پلول میر صاحب (سیّد مطلبی) کی دعوت پر آئے تھے''۔[12]

آئی اے رحمان (بعد از تقسیمِ ہند مقیم لاہور) نے اپنے بچپن کے واقعات لکھے ہیں جن کا زمانہ انھوں نے خود 1939 اور 1940 لکھا ہے، اس لیے یہ باباے اردو کا دوسرا سفر تھا۔ اس سے یہ بات تو پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ سیّد مطلبی کو باباے اردو نے کو جس کام یعنی میواتی شاعری کا ذخیرہ جمع کرنے پر مامور کیا تھا وہ انھوں نے اس موقعے پر باباے اردو کے سپرد کیا تھا۔ لیکن ان کی میواتی زبان اور اس کے نمونوں کو شائع کرنے کی خواہش شاید پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی۔ اگر ایسا ہو جاتا تو یہ اردو کی ایک اہم خدمت ہوتی اور اس کے ذریعے یہ بھی واضح کرنا آسان ہو جاتا کہ اردو زبان کی تشکیل میں میواتی زبان کا کیا کردار ہے۔

مولانا کمال سالارپوری نے چودھری کنول خاں پر جو مضمون لکھا ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ باباے اردو اس سے قبل بھی ایک مرتبہ میوات جا چکے تھے اس طرح یہ غالباً ان کا تیسرا سفرِ میوات تھا۔

میوات کی دیگر شخصیات اور باباے اردو

باباے اردو کی میوات سے دلچسپی اور میوات کے اسفار کے بارے میں اور بھی بہت سے شواہد موجود ہیں مثلاً چودھری شہاب الدین خاں میو (حال مقیم امریکہ) نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ باباے اردو نے انھیں بتایا کہ وہ میوات کے ایک سفر میں میو قوم کے مشہور قائد و رہنما چودھری محمد یاسین خاں کے یہاں بھی مہمان رہے۔[13] میوات کی ایک بڑی مقتدر اور صاحبِ علم و ادب شخصیت چودھری کمال سالارپوری (بعد از تقسیمِ ہند مقیم لاہور) نے چودھری کنول خاں[14] کے حالات میں لکھا ہے کہ:

> ''...باباے اردو مولوی عبدالحق اور بہت سے حضرات سے ان کے ذاتی اور گہرے مراسم تھے باباے اردو ایک سے زائد بار چودھری صاحب کے مہمان رہے تھے''۔[15]

چودھری کنول خاں کانگریسی لیڈر تھے اور چودھری محمد یاسین خاں کے دستِ راست مانے جاتے تھے۔ میوات میں ان کا قصبہ ''آلی میو'' تھا میواتی زبان و ادب سے ان کو بہت دل چسپی تھی۔ ان سے باباے اردو کا رابطہ بھی غالباً میواتی زبان میں ان کی دل چسپی سے ہوا ہوگا۔ سیّد مطلبی بھی کنول خاں کی زبان دانی اور خطابت کے معترف تھے جیسا کہ انھوں نے ہفت روزہ ''ہماری زبان'' دہلی میں ایک مضمون میں لکھا ہے۔

باباے اردو کے سفرِ میوات کا تذکرہ میوات کے لوگ اب بھی کرتے ہیں۔ راقم الحروف کو مولانا محمد الیاس ندوی میواتی (پ 1925، وفات دسمبر 2017) نے بتایا کہ باباے اردو قصبہ نوح کے آس پاس متعدد گاؤں میں گئے تھے اور میواتی شاعری کے مختلف نمونوں کو سنا اور ان کی بڑی تعریف کی۔ (اس کا تذکرہ مولوی عبدالحق کے مذکورہ خط میں بھی ہے۔) مولانا نے مزید بتایا کہ کئی مواقع پر مولوی عبدالحق نے درج ذیل دوہا کی بڑی تعریف کی تھی:

> تنک سَرَک تو سو کہی کیا دکھ بِیا پو توئے
> جیسے بَستر تجی بُھجنگ نے تو ایسے تَج گو موئے

اس شعر میں ایک عورت جس کا شوہر اس سے ناراض ہو کر بھوپال چلا گیا تھا، اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتی ہے کہ میں نے تم سے ذرا سا ہٹنے یا سرک جانے کے لیے کہا تھا۔ تم تو اتنا ناراض ہو گئے کہ مجھ کو چھوڑ کر ایسے چلے گئے جیسے بھجنگ یعنی سانپ اپنی بستر یعنی کینچلی کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔[16]

مولانا ندوی کے بقول باباے اردو اس شعر میں دی گئی تشبیہ کے بارے میں کہتے تھے کہ یہ تشبیہ بلاغت کی اعلا مثال ہے ایسی تشبیہات ترقی یافتہ زبانوں میں بھی کم ملتی ہیں۔

میوات کی ایک اور مقتدر ہستی اور ''تاریخ میو مہر'' کے مصنف چودھری محمد صالح خاں ایڈوکیٹ مرحوم (م: 14 دسمبر 2008، فیروزپور جھرکہ) بھی اس کا تذکرہ کیا کرتے تھے کہ انھوں نے بھی باباے اردو کو نوح (میوات) میں دیکھا تھا۔ اسی طرح ''انقلاب 1857 اور میوات'' کے مصنف انجینئر صدیق احمد میو کے والد جناب عبدالعزیز (م: 9 دسمبر 2003) بھی کہتے تھے کہ میں نے باباے اردو کو میوات میں دیکھا تھا۔ گاؤں میں عام طور پر بڑے بوڑھے اپنی بیٹھکوں پر حقہ پیتے رہتے تھے اور دنیا جہاں کے مسائل پر بحث ہوتی رہتی تھی، مولوی عبدالحق ان میں بیٹھ جاتے اور شعر و شاعری کے حوالے سے کچھ دریافت بھی کرتے رہتے، کچھ چیزیں نوٹ کرتے رہتے۔ باباے اردو کے اسفارِ میوات سے متعلق ایسے واقعات اور لوگ بھی سناتے تھے۔

کراچی میں باباے اردو سے مولانا کمال سالارپوری کی ملاقات

باباے اردو میواتی زبان کے ادبی سرمایے کو مرتب کرانے کے حد درجہ خواہش مند تھے۔ اس سفر میں کیا ہوا اس کا تو پتا نہیں لیکن وہ سیّد مطلبی کو بار بار اس کی طرف توجہ دلاتے رہے کہ وہ اس کام کو مکمل کریں۔ اس کا تذکرہ مولانا کمال سالارپوری نے میو قوم کے معروف ادیب، شاعر اور صحافی اور مجلّات ''سازِ نو'' اور ''میو منشور'' (کراچی) کے مدیر جناب چودھری مشتاق احمد خان پر اپنے مضمون میں کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

> ''کراچی میں قیام کے دوران سب سے اہم اور یادگار ملاقات چودھری مشتاق احمد خاں نے باباے اردو مولوی عبدالحق سے کروائی۔ جب میں کراچی پہنچا تو ایک روز چودھری صاحب نے بتایا کہ ہم باباے اردو مولوی عبدالحق سے رابطے میں ہیں۔ گاہے گاہے ان کی خدمت میں حاضری ہوتی رہتی ہے۔ مولوی صاحب بہت شفقت سے پیش آتے ہیں۔ وہ میواتیوں سے بہت محبت کرتے ہیں۔ میواتی شعر و ادب میں بہت دل چسپی رکھتے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ اس موضوع پر کام ہو۔ وہ بتاتے ہیں کہ انھوں نے اس مقصد کے لیے میوات کے کئی سفر بھی کیے تھے۔ انھوں نے اس موضوع سے متعلق کافی مواد و لوازمہ جمع کیا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ میواتی اور اردو کا تعلق بہت گہرا ہے اس لیے اس حوالے سے کام کے لیے میواتی شعر و ادب پر تحقیق کی بہت ضرورت ہے۔ اسے شائع بھی ہونا چاہیے۔ چودھری صاحب نے بتایا کہ چند روز پہلے مولوی صاحب سے ہونے والی ملاقات میں، میں نے آپ کا تعارف کرایا تھا اور آپ کی کراچی آمد کے بارے میں انھیں بتایا تھا۔ مولوی صاحب نے آپ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ چناں چہ اگلے روز ہم مولوی صاحب کے دفتر پہنچ گئے۔ وہ بہت محبت سے پیش آئے۔ چودھری صاحب نے میرا تعارف کرایا۔ میں نے اپنی کتاب 'جنگ نامہ میوات' ان کی خدمت میں پیش کی جسے انھوں نے سرسری دیکھا پھر فرمایا کہ آپ نے یہ بہت اچھا کام کیا ہے میں اسے دل چسپی سے پڑھوں گا۔ اس مختصر سی ملاقات میں ہونے والی جو چند باتیں آج بھی مجھے یاد ہیں وہ یہ کہ انھوں نے بتایا تھا کہ ہاپوڑ میں کچھ میو گھرانے آباد تھے جن کی جرأت و بہادری کی پورے علاقے میں دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ سارے علاقے میں ان کا رعب و دبدبہ تھا۔ بچپن میں ہمارا ان خاندانوں کے نوجوانوں سے ملنا جلنا تھا۔ مجھے میواتی زبان کی جو سدھ بدھ ہے، یہ اسی ربط و تعلق کا نتیجہ ہے۔ مولوی صاحب نے یہ بھی بتایا کہ جب مجھے اردو کے سلسلے میں میواتی زبان کی اہمیت کا احساس ہوا تو میں نے اس سلسلے میں نہ صرف میوات کے اہلِ علم و ادب سے تعلق پیدا کیا بلکہ میوات کے کئی سفر بھی کیے۔ مولوی صاحب نے بتایا کہ میں نے میواتی شعر و ادب پر جو مواد اکٹھا کیا تھا۔ وہ میوات کے سرکردہ حضرات سیّد ہاشمی فریدآبادی، چودھری محمد یاسین خاں میو اور چودھری کنول خاں میو کے مشورے سے ہاشمی صاحب کے چھوٹے بھائی سیّد مطلبی فریدآبادی کے سپرد اس تقاضا کے ساتھ کر دیا تھا کہ وہ اس پر کام کریں گے۔ چودھری یاسین خان نے الور کی میو پنچایت کی طرف سے ان کے لیے اس کام پر معاوضہ بھی طے کر دیا تھا۔ مولوی صاحب نے افسوس کا اظہار کیا کہ وہ اپنی سیاسی و فکری سرگرمیوں کی وجہ سے اس اہم موضوع پر چند مقالات و مضامین ہی لکھ پائے۔ مطلبی صاحب تقسیمِ ہند کے بعد لاہور آ کر آباد ہو گئے تھے۔ مولوی صاحب نے میرے ذمہ لگایا کہ میں لاہور واپسی پر ...

(بقیہ صفحہ 6 پر)

بقیہ: حمایت علی شاعر: شخصیت وفن

[صفحہ 1 سے آگے]

کوئی تازہ شعر اے ربِّ جلیل
ذہن کے غارِ حرا میں کب سے
فکر محوِ انتظار جبرئیل

(الہام)

یہ ایک پتھر جو راستے میں پڑا ہوا ہے
اسے محبت تراش دے تو یہی صنم ہے
اسے عقیدت نواز دے تو یہی خدا ہے

(زاویۂ نگاہ)

حمایت علی شاعر نے اپنی خودنوشت 'آئینہ در آئینہ' منظوم لکھی ہے جو اردو کی پہلی منظوم خودنوشت ہے۔ پوری نظم پابند اور ایک ہی بحر میں ہے۔ اس میں تین ہزار اشعار ہیں۔ 'افکار' کراچی میں چار سال دو ماہ تک بالاقساط شائع ہوکر مقبول ہوئی۔ اس میں انھوں نے اپنی زندگی کے واقعات و مشاہدات اور تجربات بہت چابک دستی سے واضح بیان کیے ہیں۔ اس میں ان کی زندگی کا ہر دور اپنی خوبیوں اور کمزوریوں کے ساتھ موجود ہے۔ حمایت علی شاعر نے اپنی خودنوشت میں سیاست، معیشت اور معاشرت کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ یہ خودنوشت مخصوص دور کی آئینہ دار ہے، انھوں نے اپنی سوانح کو ایک نئی جہت دے دی ہے۔ یہ سوانح حمایت علی شاعر کے تاریخی شعور اور مسائل کے ادراک کی مظہر ہے۔

حمایت علی شاعر کا کمال یہ ہے کہ واقعات وحقائق کو بیان کرنے میں نظم میں کسی قسم کا سقم پیدا نہیں ہوا۔ نظم پر ان کی گرفت مضبوط ہے۔ اس سوانح میں انسان کے دل کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں۔ ایسی دنیا جہاں محبت کرنے والے رشتے دار ہیں، ان کے دکھ سکھ ہیں۔ اس خودنوشت میں بڑا تاثر ہے۔ ہندستان سے پاکستان جانے کا ارادہ کرنے میں انھیں کافی وقت لگا، اپنے پیاروں کو چھوڑ کر جانا ایک قیامت سے کم نہیں ہوتا وہ پختہ ارادہ کے مالک تھے۔ لکھتے ہیں:

میں دل سے کر چکا تھا ارادۂ ہجرت
تو چھوڑ آیا اِک روز پیار کی دولت

ان کے اسلوب میں شگفتگی، بے ساختگی اور شائستگی ہے۔ سلاست، سادگی اور روانی ہے۔ یہ منظوم خودنوشت حمایت علی شاعر کی قادرالکلامی کا بہترین شاہکار ہے۔ اس خودنوشت کی آخری قسط میں حمایت علی شاعر اپنے گھر اور بچوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

ہیں میرے بیٹے بھی چار اور بیٹیاں بھی چار
خدا کا شکر کہ ہیں سب میرے آئینہ دار
غریب، سادہ، قناعت پسند، باکردار
خود اعتماد، خود آگاہ اور بہت خوددار
یہ جاوداں ہے، وہ فروزاں ہے یہ غزالاں ہے
جو سب سے چھوٹی سی 'گڑیا' ہے وہ زرافشاں ہے
جو چار بیٹے ہیں روشن خیال و اوج کمال
یہ ذو الجمال تو وہ ہے مرا بلند اقبال
ہر ایک بیٹا کہ آئینہ اپنے نام کا ہے
کہ پاس اس کو بھی، اجداد کے مقام کا ہے
یہ باغ اور یہ پودے یہ بار دار شجر
یہ ایک سے ہوئے دو، دو سے بس گیا اِک گھر
جو گھر بسے ہیں ہمارے، سدا رہیں آباد
ہمارے پھول سی بہوئیں ہمارے سب داماد

'آئینہ در آئینہ' کی آخری قسط کے آخری اشعار میں لکھتے ہیں:

کہاں سے چل کے کہاں آ گئے مگر حاصل؟
وہی ہیں لوگ وہی راستے وہی منزل
وہی قلم، وہی الفاظ اور وہی افکار
میں ایک یوسف کنعاں یہ مصر کا بازار
کوئی شجر نہ حجر ہے تھکن سی طاری ہے
ابھی ہیں کام بہت اور سفر بھی جاری ہے

حمایت علی شاعر عمر کے آخری پڑاؤ تک سرگرم رہے۔ انھوں نے خود کہا تھا:

''میں ادب کی بارگاہ میں آواز دیے جاتا ہوں میں حاضر ہوں۔ میں حاضر ہوں''۔

حمایت صاحب اس دنیا سے بظاہر رخصت ہوگئے مگر وہ اپنے فن کے ساتھ حاضر ہیں خود ان کا شعر ہے:

مجھے غریب نہ جانو جو میں اُفق پہ نہیں
بکھر گیا ہوں اندھیرے میں کہکشاں کی طرح

حمایت علی شاعر کے ساتھ ہی اردو شاعری کا ایک دور ختم ہوا۔ اردو شعر وادب میں ان کا نام وکام ہمیشہ دائم وقائم رہے گا۔

ڈاکٹر رضیہ حامد
سیکنڈ فلور، شبستان اپارٹمنٹ، سیّد فتح علی اسٹریٹ، عیدگاہ ہلز،
بھوپال-462001 (مدھیہ پردیش)

بقیہ: بابائے اردو مولوی عبدالحق اور میوات

[صفحہ 3 سے آگے]

مطلبی صاحب کو ان کا سلام پہنچاؤں اور ان سے اس کام کی تکمیل کے لیے تقاضا کروں۔ مولوی صاحب سے یہ ملاقات واقعی بہت خوش گوار تھی۔ ہم نے مولوی صاحب سے اجازت لی۔ لاہور پہنچ کر میں ایک روز جناب سرور میواتی اور چودھری عظیم الدین خان میو (ایڈوکیٹ) کے ہمراہ سیّد مطلبی فرید آبادی سے ملنے کے لیے ہائی کورٹ کے قریب ان کے دفتر پہنچ گیا۔ ان سے پہلے بھی ایک دو ملاقاتیں انجمن مہاجرینِ میوات کے اجلاسوں میں ہوچکی تھیں۔ بہت محبت سے پیش آئے۔ میں نے کراچی کے سفر اور مولوی صاحب سے ہونے والی ملاقات کا ذکر کیا، ان کا سلام پیش کیا اور تقاضا دہرایا۔ انھوں نے کہا کہ میں اس کام سے غافل نہیں ہوں، میں نے کافی کام کرلیا ہے میں اسے جلد مکمل کر کے مولوی صاحب کی خدمت میں نظر ثانی و دیباچہ کے لیے پیش کروں گا اور جلد اسے شایع بھی کرواؤں گا۔ لیکن غالباً وہ اسے مکمل نہیں کر سکے''۔[17]

چودھری مشتاق احمد سے مولوی عبدالحق کے خصوصی مراسم تھے اور ان سے ملنے کے لیے وہ اکثر ان کے دفتر جایا کرتے تھے۔

پنہاری کا پیش لفظ

سیّد مطلبی میواتی زبان میں شاعری کرتے تھے اور ان کے کئی مجموعے اس زبان میں شائع ہوئے۔ میواتی زبان میں ان کا ایک منظوم ڈرامہ 'پَنہاری' کے نام سے ہے۔ بابائے اردو نے اس پر پیش لفظ لکھا تھا۔ اپنے پیش لفظ میں انھوں نے اس کتاب میں استعمال کردہ زبان کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

''پوری کتاب خالص دیہاتی زبان میں ہے۔ نئی ہندی کے حامی جو یہ دعوی کرتے ہیں کہ ہم نے یہ زبان اس لیے اختیار کی ہے کہ ہماری آواز دیہاتیوں تک پہنچے وہ اسے پڑھیں اور دیکھیں کہ ان کی ہندی نہ دیہاتیوں کی زبان ہے نہ شہریوں کی''۔[18]

بابائے اردو نے اس کتاب کے اسلوب کی بھی بڑی تعریف کی ہے اور اس کے کچھ حصے اپنے تعریفی نوٹ کے ساتھ اپنے پیش لفظ میں نقل کیے ہیں۔ مثلاً رات کا منظر اس طرح بیان کیا ہے:

رات کا سماں دیکھیے:

رین نے اپنی نندیا کھولی
پھڑ پھڑ کرنے لاگے پکھیرو   بولا چٹان پر ہُو ہُو اُلو
اُڑ گئے تاروں کے چہرے   بچھڑ گئے سب ریلے میلے
پھرنے لگا آکاس پے پانی   روکھوں پے آئی نئی جوانی
اگھن پوَن میں پھُر پھُر ناچے   گائے تو سیٹی سی بجے

اس کتاب کی اصل ٹریجڈی یعنی ڈرامے کے المیے کا تذکرہ کرتے ہوئے بابائے اردو نے لکھا ہے:

''جب کالا (کسان) بنیے کو قتل کر کے بھاگ جاتا ہے اور سادھو بن کر جنگل جنگل پھرتا ہے، تو اسی اثنا اپنی بیوی سے اس کی ملاقات ہوجاتی ہے۔ بیوی اس کے ساتھ چلنے پر اصرار کرتی ہے تو وہ کہتا ہے تیرا میرا ساتھ نہیں ہوسکتا تو اس جوانی میں میرے ساتھ کہاں ماری ماری پھرے گی، میری طرف سے تو آزاد ہے، اس وقت جو وہ بگڑ کر اسے طعنے دیتی ہے اور پھر منت وسماجت کرتی ہے وہ مقام پڑھنے کے قابل ہے۔ آخر وہ دامن چھڑا کر چل دیتا ہے اور اسے زمین پر روتا ہوا چھوڑ جاتا ہے اُس وقت کا منظر اس طرح کھینچا ہے:

لپ جھپ کر پھر بھُریا اُٹھے   چاروں اور سادھو کو دیکھے
''ساجن ساجن'' پھر چلائی   ساجن نے کچھ کی نہ سنائی
اِدھر اُدھر پھر بھُریا ڈولی   ناروئی نامکھ سے بولی
دیکھے اپنی کلائی بھُریا   برگد نیچے آئی تریا
اِک اک کر کے چوڑی تاری   بالی، جھومر باری باری
گھنگرو کھولے، بچھوا تارے   کھول کھال سب نیچے ڈالے
جوتی اتار چڑھی برگد پر   پہنچ گئی ڈالے کے حد پر
پوکھر میں بَرگد کی چھایا   چھایا میں تریا کا سایا
لپک لپک کر سایا چالے   پتے ہالیں، ڈالا ہالے
ناہی اٹکی ناہی سونچی   ڈالے کی ٹنگلی پر پہنچی
آنکھ لڑاوے اور تھراوے   پون میں کونپل سی لہراوے
پوکھر میں پھر چھال لگائی   امبر سے یوں تریا آئی
آندھی میں جوں امبیا ٹپکے   اندھیاری میں جگنو لپکے
تپک سے جیسے گولی چالے   گوپھن پھینکیں جے رکھوالے
گڑپ سے جل میں تریا آئی   جل دیوانے کری سنائی

یہ سماں شاعر نے خوب دکھایا ہے اور ایسے کتاب میں کئی مقام ہیں''۔[19]

ہاشمی برادران کے ساتھ بابائے اردو کا علمی وتحقیقی تعلق عمر بھر قائم رہا۔ سیّد ہاشمی فرید آبادی نے بابائے اردو کے ساتھ مل کر جو تحقیقی کام کیے وہ اردو کی علمی روایت کا لازوال حصہ ہیں، ان کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ سیّد ہاشمی نے بقولِ خود ان کے زندگی کے کم وبیش پچاس سال مولوی صاحب کی خدمت میں گزارے[20] اور ان کی وفات کے بعد ان کی روایات کے امین اور پاسدار بنے۔ لاہور سے شائع ہونے والے علمی مجلّہ ''ہمایوں'' نے 1958 میں ایک خاص شمارہ شائع کیا تھا اس شمارے میں بابائے اردو پر ایک خاکہ سیّد ہاشمی نے لکھا تھا بلکہ سیّد ہاشمی کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ 'ہمایوں' کے ذمے داروں نے اصرار کر کے ان سے وہ خاکہ لکھوایا تھا۔ خیال رہے کہ یہ خاکہ بابائے اردو کی زندگی میں شائع ہوا۔

ہاشمی فرید آبادی کے پورے خاندان سے ہی ان کے گہرے مراسم تھے۔ مطلبی فرید آبادی کا تذکرہ اوپر آچکا ہے، ان کے ایک اور بھائی ابو تمیم فرید آبادی نے سیّد ہاشمی فرید آبادی کے حکم پر بابائے اردو کے خطوط کا ایک مجموعہ تیار کیا اور ''اردوئے مصفّیٰ'' کے نام سے 1961 میں لاہور سے شائع کیا۔ اس کتاب کے شروع میں انھوں نے بابائے اردو کے مختصر سوانحی احوال بھی لکھے ہیں۔ (باقی آئندہ)

دوسری اور آخری قسط

بابائے اُردو مولوی عبدالحق اور میوات

مشتاق احمد تجاروی

خانقاہ شعیبیہ، تجارہ (میوات) کے مخطوطات کا قصہ اور بابائے اردو

میوات کے تعلق سے بابائے اردو مولوی عبدالحق (1870-1961) کی زندگی کا ایک اہم سلسلۂ واقعات میوات کے قصبہ تجارہ کی خانقاہ شعیبیہ میں موجود دو قلمی دیوانوں سے متعلق ان کی دلچسپی کی داستان ہے۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ جنوری 1944 کے ماہنامہ ''معارف'' اعظم گڑھ[۲۱] میں ڈاکٹر رشید الدین تجاروی کا ایک مضمون 'نواحِ دہلی کی اردو کی دو قدیم ترین کتابیں' شائع ہوا۔ اس مضمون میں مصنف نے دعویٰ کیا تھا کہ تجارہ کی خانقاہ شعیبیہ میں شاہ غلام رسول کی تصنیف کردہ ایک کتاب 'مثنوی واقعاتِ امامیہ' ہے جو ہمایوں کے عہد میں یعنی 939ھ مطابق 1533 میں لکھی گئی تھی۔ انھوں نے اس کتاب میں سے کچھ نمونے کے اشعار بھی اس مضمون میں نقل کیے تھے۔ اسی خانقاہ میں ایک دوسری کتاب شاہ غلام رسول کے برادر زادے شاہ محمد اشرف منعم کا دیوان ہے۔ اس میں سے بھی کچھ نمونے نقل کیے تھے۔ اس مضمون کی اشاعت کے بعد علمی حلقوں میں ان کتابوں کا تذکرہ شروع ہوا۔ یہ مضمون مولوی عبدالحق کی نظر سے بھی گزرا اور انھوں نے ان کتابوں یا ان کی نقل حاصل کرنے کی جدوجہد شروع کر دی۔ اسی دوران مارچ 1944 کے 'معارف' کے شمارے میں نصیر الدین ہاشمی نے اس مضمون پر تنقید لکھی جس میں ان کتابوں کے عہدِ تصنیف پر شک کا اظہار کیا۔ نصیر الدین ہاشمی کے مضمون کا جواب محمد خلیل تجاروی نے جنوری 1945 میں لکھا[۲۲] اس مضمون میں بابائے اردو کے ایک خط کا بھی حوالہ ہے جو انھوں نے خانقاہ شعیبیہ کے سجادہ نشین کے نام لکھا تھا، اس خط کا سلسلہ نمبر 5349 ہے۔ اس خط میں لکھا ہے:

> ''میرے کتب خانے میں قدیم اردو کے کئی سو قلمی نسخے موجود ہیں، مگر آپ کے حضرت شاہ غلام رسول اور دیوانِ منعم کا کلام نہیں ملا۔ آپ کی بدولت اس کی اطلاع پہلی بار ملی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ میں آپ کی وساطت سے اس کی زیارت کر سکوں۔ مثنوی میں ہمایوں بادشاہ کا نام اور اس کی مدح موجود ہے جو کافی ثبوت اس امر کا ہے کہ اس وقت کی لکھی ہوئی ہے۔ میں آپ سے مل کر اس مثنوی اور دیوانِ منعم کے متعلق گفتگو کرنا چاہتا تھا، یا یہ ممکن نہ ہو تو پھر دوسری صورت یہ ہے کہ ان کی نقلیں مل جائیں''۔[۲۳]

ان مثنویوں کے بارے میں 'معارف' کے صفحات پر جو بحث چل رہی تھی اس سلسلے کا آخری مقالہ پروفیسر نورالحسن ہاشمی نے لکھا تھا جو جون 1945 کے 'معارف' میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مولوی عبدالحق کو ان کتابوں سے کتنی دلچسپی تھی۔ پروفیسر نورالحسن نے لکھا ہے:

> ''رسالہ 'معارف' شمارہ جنوری ۱۹۴۵ میں دیوانِ منعم اور مثنوی واقعاتِ امامیہ کے متعلق پھر محمد خلیل صاحب بی ایس سی علیگ کا مضمون شائع ہوا۔ چوں کہ میں انجمن ترقی اردو کی طرف سے پچھلے سال ان کتابوں کے جانچنے پر مامور کیا گیا تھا اس لیے میرا فرض ہے کہ اپنے خیالات کا اظہار ان کتابوں سے متعلق کروں۔
> پچھلے سال جناب ولی محمد صاحب، سجادہ نشیں، خانقاہ تجارہ عرس حضرت نظام الدین اولیا میں شرکت کی غرض سے تشریف لانے والے تھے تو قبلہ مولوی عبدالحق صاحب نے انھیں لکھ دیا تھا کہ اگر آپ اپنے ہمراہ یہ دونوں کتابیں لیتے آئیں تو یہاں دیکھنے پر واضح ہو سکے گا کہ یہ کس عہد کی کتابیں ہیں۔ چوں کہ مولوی صاحب قبلہ اس زمانے میں دہلی سے باہر جانے والے تھے اس لیے یہ کام میرے سپرد کر گئے تھے۔ میں نے مسجد قاضی حوض دہلی میں سجادہ نشین صاحب موصوف سے ملاقات کی۔ وہ صرف دیوانِ منعم اپنے ہمراہ لائے تھے اور وہ بھی اوّل و آخر سے ناقص اور بیچ کے اوراق بھی جگہ جگہ سے غائب تھے۔ واقعاتِ امامیہ کے متعلق ارشاد فرمایا کہ ان کے برادرِ کلاں اسے دہرہ دون اپنے ہمراہ لے گئے ہیں، بعد کو دکھائی جا سکے گی۔
> دیوانِ منعم کو ایک نظر ہی دیکھنے سے معلوم ہو گیا کہ یہ وسط بارہویں صدی سے پیشتر کا کلام نہیں ہو سکتا۔ ولی کی غزلوں پر کئی غزلیں اس میں موجود ہیں''۔[۲۴]

میوات سے متعلق بابائے اردو مولوی عبدالحق کی زندگی کا یہ ایک اہم باب ہے کہ انھوں نے دور دراز مقام پر میوات کے دیہاتی شعرا کا کلام مرتب کرایا۔ اس کا تذکرہ ان کی سوانح حیات میں یا ان پر ہوئے علمی کاموں میں نہیں مل سکا۔ پنہاری کے پیش لفظ اور ان کے خطوط اور 'معارف' جیسے موقر جریدے کے حوالے سے ان کی میوات سے متعلق دلچسپی ایسی حقیقت ہے جس کی صداقت میں کوئی کلام نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم اس سلسلے میں مزید کام کی ضرورت ہے۔ خانقاہ شعیبیہ تجارہ کے سجادہ نشین ولی محمد صاحب کے نام ان کے ایک خط کا اقتباس ماہنامہ 'معارف' کے شمارے میں شائع ہو گیا ہے وہ بھی مطبوعہ خطوط میں شامل نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اس سلسلے کے اور خطوط بھی ہیں جو ہنوز دستیاب نہیں ہیں ممکن ہے مولوی صاحب کے کاغذات میں ان کی نقلیں موجود ہوں۔

خانقاہ شعیبیہ تجارہ جہاں ان دونوں کتابوں کے مخطوطات محفوظ تھے وہ 1947 کے ہنگاموں میں تباہ ہو گئی اور اس کے ساتھ اس میں محفوظ مخطوطات اور نادر ذخیرے بھی برباد ہو گئے۔ اب ان کتابوں کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ البتہ ماہنامہ 'معارف' میں ان کے جو نمونے شائع ہو گئے ہیں ان سے ان کی یادگار باقی رہ گئی ہے۔

الور میں اردو

بابائے اردو اور میوات کے حوالے سے ایک اور بات کا تذکرہ نامناسب نہ ہو گا کہ انجمن ترقی اردو نے 1940 میں 'جائزہ زبانِ اردو' کے نام سے ایک کتاب مرتب کی تھی۔ یہ کتاب خود بابائے اردو کی مرتب کردہ ہے۔ ان کا مقدمہ بھی اس میں شامل ہے۔ اس کتاب کے پہلے حصے میں راجپوتانہ کی ریاستوں میں اردو کی صورتِ حال پر نہایت جامع جائزے پیش کیے گئے ہیں۔ ریاست الور پر صفحہ 193 سے 217 تک اور ریاست بھرت پور پر صفحہ 167 سے 180 تک مفصل رپورٹ ہے۔ ریاست الور پر رپورٹ میں یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ الور میں موجود ایک بڑا مقبرہ جو فتح جنگ کا مقبرہ کہلاتا ہے اور اس کی عالی شان عمارت اب بھی قائم ہے اس میں انجمن ترقی اردو کا دفتر قائم کیا جائے جو الور اور میوات میں اردو کی ترویج و اشاعت کا کام کرے۔ اس رپورٹ میں لکھا ہے:

> 'اگر انجمن کوشش کرے اور نظام گورنمنٹ[۲۵] کی جانب سے کچھ امداد مل جائے تو شبیر حسن صاحب کو ملازم رکھ کر اس میں مدرسہ کھولا جا سکتا ہے۔ اور یہی مدرسہ اردو کی اشاعت کا مرکز بھی ہو گا۔ فی الحال انجمن ترقی اردو کے نام سے کوئی انجمن بنانا زیادہ مفید نہیں ہو سکتا۔ اگر الور کے لیے یہ بنیادی امداد دے دی گئی تو پیر جمانے کے بعد علاقہ میوات کے مسلمان باشندوں کو اردو کی ترقی کے لیے آمادہ کیا جا سکتا ہے۔ اور یقیناً بہت تھوڑی مدت میں وہ وقت آ سکتا ہے کہ انجمن کی قائم کی ہوئی یہ شاخ الور کے چپے چپے پر اردو مکتب کھول سکتی ہے۔ ان مکاتب کے اخراجات بھی خود مقامی لوگ دیں گے''۔[۲۶]

اسی رپورٹ میں ایک سفارش یہ بھی ہے کہ میو قوم کے سرداروں کو اردو زبان کی حمایت پر پوری طرح آمادہ کیا جائے۔[۲۷]

یہ رپورٹ بابائے اردو نے تیار نہیں کی تھی بلکہ الور سے یہ رپورٹ تیار کر کے ان کی خدمت میں بھیجی گئی تھی لیکن اس کی اشاعت بابائے اردو کے مقدمہ کے ساتھ ہوئی۔ بابائے اردو کے تعلق سے یہ بھی اہم اطلاع ہے کہ وہ الور میں انجمن کی شاخ کھولنے کے خواہش مند تھے۔

کراچی میں میو لائبریری کا بابائے اردو کے ہاتھوں افتتاح

تقسیمِ ملک کے بعد بابائے اردو مولوی عبدالحق پاکستان چلے گئے لیکن میوات کے ساتھ ان کا جو تعلق قائم ہو گیا تھا وہ وہاں بھی بدستور قائم رہا۔ حالاں کہ اب اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنا کافی مشکل ہے پھر بھی کوشش کی جائے تو ابھی کچھ حوالے اور کچھ سلسلے اس موضوع پر دریافت کیے جا سکتے ہیں اس کے لیے ذوق اور جذب دونوں کی ضرورت ہے، ایسا جذب و ذوق جیسا برادر مکرم شبیر احمد خاں میواتی کے اندر ہے۔ انھوں نے پاکستان میں میو حضرات کے ساتھ بابائے اردو کے روابط کے سلسلے میں کئی حوالے دریافت کیے ہیں ایک حوالہ اوپر گزر چکا ہے اس کے علاوہ ایک اہم حوالہ یہ ہے کہ آل پاکستان میو سوشیل آرگنائزیشن کی طرف سے کراچی میں ایک فری لائبریری قائم کی گئی تھی۔ مولوی عبدالحق نے اس کا افتتاح کیا اور اس موقع پر ایک تقریر بھی کی اور لائبریری کے لیے اپنی جیبِ خاص سے تعاون بھی کیا۔ شبیر احمد خاں میواتی نے اس موقع کی کچھ تصاویر بھی فراہم کر لی ہیں۔ یہ لائبریری اور فرسٹ ایڈ پوسٹ جناب چودھری شہاب الدین خاں میو (حال مقیم امریکہ) نے اپنے میو رفقا کے تعاون و اشتراک سے قائم کی تھی۔ اس کا افتتاح 25 دسمبر 1954 کو ہوا اور اس کے افتتاح کی خبر اس وقت کے اخباروں میں شائع ہوئی۔ اس زمانے کا ایک مؤقر انگریزی اخبار مارننگ نیوز (Morning News) کراچی تھا۔ اس کی 27 دسمبر 1954 کی اشاعت میں اس لائبریری کے افتتاح کی خبر شائع ہوئی، جس کا ترجمہ حسبِ ذیل ہے:

مفت دارالمطالعہ اور لائبریری کا قیام

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے ہفتہ کے دن ایک جمِ غفیر کی موجودگی میں قائد آباد میں ایک مفت دارالمطالعہ اور لائبریری اور فرسٹ ایڈ پوسٹ کا افتتاح کیا، یہ لائبریری آل پاکستان میو سوشیل آرگنائزیشن نے قائم کی۔ اس میں شہر کے میو اور دوسری سرکردہ شخصیات نے شرکت کی۔

بابائے اردو نے مادری زبان، ملک اور انسانیت کے لیے میوؤں کی خدمات کو سراہتے ہوئے خود بھی 50 روپے کا عطیہ دیا۔

یہ خبر اور اخبارات میں بھی شائع ہوئی تھی اس خبر کے عنوان سے شاید یہ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ یہ لائبریری اور فرسٹ ایڈ پوسٹ صرف میو قوم کے لیے مختص ہے اس لیے اس کے بانی جناب شہاب الدین خاں نے

مراسلات کے ذریعے اس کی وضاحت کی کہ یہ عام ہے صرف میووں کے لیے نہیں۔ انگریزی کے ایک اور روزنامہ ڈان (Dawn) کراچی کے 4 جنوری 1955 کے شمارے میں شہاب الدین خاں کا وضاحتی خط شائع ہوا، جس کا ترجمہ ہے:

تصحیح

محترم۔ آپ نے قائدآباد (کراچی) میں قائم ہونے والے مفت دارالمطالعہ (فری لائبریری) اور فرسٹ ایڈ پوسٹ کے افتتاح کی خبر اپنے مؤقر اخبار کے 27 دسمبر (1954) کے شمارے میں شائع کی تھی۔ اس کے لیے ہم آپ کے شکرگزار ہیں۔ تاہم ہماری انجمن کا احساس ہے کہ خبر کے عنوان سے غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے کہ یہ لائبریری صرف میووں کے لیے ہے۔ اس لیے یہ وضاحت ضروری ہے کہ یہ لائبریری سب کے لیے ہے، میووں کے لیے مخصوص نہیں ہے۔

آپ کا نیازمند

شہاب الدین

برائے صدر آل پاکستان میوسوشیل آرگنائزیشن، کراچی)

باباے اردو نے اس موقعے پر ایک تقریر بھی کی تھی۔ اس لائبریری کے بانیوں میں سے جناب شہاب الدین خاں الحمدللہ بقیدِ حیات ہیں آج کل امریکہ میں مقیم ہیں ان سے برادرم شبیر احمد خاں میواتی (لاہور) نے رابطہ کیا اور انھیں آمادہ کیا کہ اس افتتاح کے سلسلے کی جو یادیں اور باتیں ان کے حافظے میں محفوظ ہیں، انھیں لکھ بھیجیں۔ انھوں نے اپنی یادداشتوں پر مشتمل جو خط لکھا وہ اس موضوع کے تعلق سے بہت قیمتی ہے اس لیے اس کو پورا نقل کیا جاتا ہے:

''امریکہ، ۲۱ جولائی ۲۰۱۹

عزیزم شبیر احمد خان میواتی، ہمیشہ خوش رہو

آپ کی یادآوری کا بے حد شکریہ

آپ کی خواہش کے مطابق میں باباے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم سے متعلق اپنی یادداشتیں ضبطِ تحریر میں لاتا ہوں۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ ان کے دفتر میں ہونے والی ملاقات نیز لائبریری کے افتتاح کے لیے ان کی تشریف آوری کی کچھ تفصیل بیان کرتے ہوئے میں انتہائی خوشی محسوس کررہا ہوں۔ یہ سب اتنا خوش گوار تھا کہ ہمیشہ حسرت ہی رہی کہ کاش ان سے اور ملاقاتیں بھی ہوئی ہوتیں۔ وہ بے شک شرافت اور انکساری کا مجسم نمونہ تھے۔

یہ ۱۹۵۴ کی بات ہے جب میں آل پاکستان میوسوشل ویلفیئر آرگنائزیشن کی انتظامی کمیٹی کا ممبر تھا اور میری تجویز پر آرگنائزیشن نے ایک لائبریری کھولنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ہم نے طے کیا کہ ہم لائبریری کا افتتاح حکومت کے کسی اعلیٰ عہدے دار کے بجائے کسی نامور ادبی شخصیت سے کروائیں گے۔ اس مقصد کے لیے ہماری نظرِ انتخاب اس وقت کی نامور ہستی باباے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی طرف گئی۔ اُس وقت اُن سے بہتر شخصیت اور کون ہوسکتی تھی۔

لہٰذا میں اور آرگنائزیشن کے وائس پریزیڈنٹ جناب چودھری محمد عبدالرؤف خان تاب اکبرآبادی وقت لے کر باباے اردو کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے نہایت محبت اور تپاک سے ہمیں خوش آمدید کہا۔ جب ہم نے ان سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو فرمایا کہ مجھ سے افتتاح کروانے سے آپ کو کیا فائدہ ہوگا۔ حکومت کے کسی بڑے عہدے دار سے کروائیں تو آپ کو مالی مدد بھی مل جائے گی اخبارات میں خبر بھی لگے گی فوٹو بھی شائع ہوں گے تشہیر بھی ہوگی۔ ہم نے کہا کہ ہمیں ان باتوں سے کوئی غرض نہیں ہے، ہمیں افتتاح کے لیے آپ سب سے زیادہ موزوں لگے ہیں ہم کو آپ ایسے مخلص اور اپنے مقصد سے لگن رکھنے والے کی ہدایت اور سرپرستی کی ضرورت ہے۔

مولوی صاحب نے ہم سے میوات کی موجودہ صورت حال اور پاکستان آکر آباد ہونے والے میووں کے بارے میں کچھ سوالات کیے۔ ہمارے جوابات پر انھوں نے فرمایا کہ مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی ہے کہ میو اب بھی میوات میں آباد اور ان کے قائد چودھری یاسین خاں نے بھی وہیں رہنے کو ترجیح دی۔ انھوں نے اس پر بھی مسرت کا اظہار کیا کہ کراچی میں بھی میو کثیر تعداد میں آباد ہوگئے ہیں۔ مولوی صاحب نے یہ بھی بتایا کہ انھوں نے میوات کے کئی دورے کیے تھے اور ایک بار وہ چودھری یاسین خان کے مہمان بھی رہے، انھوں نے بہت خاطر تواضع کی تھی۔ چودھری صاحب نے بڑی محنت اور جدوجہد سے قائم کردہ برین میوہائی اسکول کا معائنہ بھی کرایا۔ باباے اردو نے مزید بتایا کہ اُس قیام کے دوران انھوں نے وہاں شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں سے ملاقاتیں بھی کی تھیں۔ میراثیوں کی محفلیں بھی سنی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ میواتی شعر و ادب بہت قیمتی ہے لیکن تحریری صورت میں نہیں ہے۔ انھوں نے اس ادب کو تحریری صورت دینے کی خواہش کا اظہار بھی کیا تھا۔ کاش ہم ان کی اس خواہش کو پورا کرسکتے۔

میں اور میرے رفقا ہم سب باباے اردو کے میوات سے تعلق کے بارے میں بالکل لاعلم تھے۔ ہمیں ان کی زبانی ان کے میوات سے خصوصی لگاؤ اور تعلق کے بارے میں جان کر بہت حیرت اور بے حد خوشی ہوئی تھی۔

۲۵ دسمبر ۱۹۵۴ کو مولوی صاحب تشریف لائے اور لائبریری کا افتتاح کیا اور اپنی جیبِ خاص سے پچاس روپیہ کا عطیہ بھی دیا جو اس زمانے میں ایک بڑی رقم تھی۔ اس موقع پر انھوں نے اپنی تقریر میں قوموں کی تعمیر و ترقی میں لائبریری کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور پھر میو قوم کی بہادری اور ہمت و جرأت کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ میو ایک نہایت بہادر اور شجاع قوم ہے، جو اپنا تابناک ماضی اور شاندار تاریخ رکھتی ہے۔ اس قوم کے نوجوانوں کا لائبریری قائم کرنا نہایت خوش آئند اور مستحسن اقدام ہے۔ آپ لوگوں کو اپنے خطے کی تاریخ اور خاص طور پر اپنی زبان اور شعر و ادب پر کام کرنا چاہیے اور اس کو محفوظ کرنے کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ انجمن ترقی اردو آپ کے ساتھ ہر طرح کے تعاون کے لیے حاضر ہے۔

مولوی صاحب اس لائبریری کے لیے اپنے ساتھ اچھی خاصی تعداد میں کتابیں لے کر آئے تھے وہ بعد میں بھی تسلسل کے ساتھ کتابیں بھجواتے رہے۔ انھوں نے انجمن کا ترجمان رسالہ 'قومی زبان' بھی لائبریری کے نام مستقل اعزازی جاری کردیا تھا۔

اس موقع پر کراچی کے میو اور دیگر سرکردہ حضرات کا ایک جمِ غفیر وہاں موجود تھا، اگرچہ بڑی بے سروسامانی تھی لیکن لوگوں میں جذبہ بہت تھا۔ لوگوں کے شوق اور بھیڑ کو دیکھتے ہوئے اس افتتاح کی خبر ریڈیو پاکستان پر اسی شام کو نو بجے والی خبروں میں آئی تھی اور دوسرے دن پاکستان کے تمام اہم اخباروں میں بھی چھپی تھی۔

میرے لیے یہ واقعات زندگی کا بہت قیمتی سرمایہ ہیں اور میں اس پر جتنا بھی فخر کروں کم ہے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

دعاگو

شہاب الدین خاں میو

یہ مقالہ رفتہ رفتہ مقالے کے فطری حدود سے تجاوز کرتا جارہا ہے لیکن مجبوری یہ ہے کہ چوں کہ دنیاے اردو کی اس عظیم شخصیت کا یہ پہلو مکمل طور پر گوشۂ گمنامی میں پڑا ہوا ہے اس لیے یہ کوشش ہے کہ جو بھی مستند معلومات اور روایات جمع ہوجائیں وہ غنیمت ہیں۔ اس سلسلے کی آخری بات یہ ہے کہ میو قوم کے ایک معروف شاعر شاہد اکبرآبادی نے 'جلوۂ خورشیدِ حرم' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے، اس میں باباے اردو کا بھی تذکرہ کیا ہے اور آخر میں باباے اردو کا ایک قطعہ تاریخ وفات بھی کہا ہے جو یہ ہے:

تھا عبدِ حق تو معرفتِ حق کے واسطے
اردو سے ربط خاص ملا تھا سرشت میں
مجنوں عشقِ لیلیٰ اردو میں چل بسا
ہوگا نفاذِ لیلیٰ اردو بہشت میں

اس قطعے کے آخری مصرع سے باباے اردو کا سنہ وفات ۱۹۶۱ برآمد ہوتا ہے[۴۸]

باباے اردو مولوی عبدالحق اور میوات سے متعلق یہ چند منتشر معروضات ہیں۔ باباے اردو کے سوانحی کوائف میں ان کو بھی مقام ملنا چاہیے۔ امید ہے کہ ان کے مطالعہ سے اس عبقری شخصیت کی زندگی کا ایک گم شدہ باب اہلِ علم ودانش کے سامنے آئے گا۔

حواشی

۱ پروفیسر مسعود حسین خاں: مقدمہ تاریخ زبانِ اردو، سرسیّد بک ڈپو، علی گڑھ، 1958، ص 71

۲ ایضاً ص 78

۳ ایضاً ص 126

۴ مرزا خلیل احمد بیگ: اردو کی لسانی تشکیل، علی گڑھ، 1958، ص 20، 45، 141

۵ میواتی زبان کے بارے میں عام تاثر یہی ہے کہ اس کا ادبی سرمایہ تحریری شکل میں موجود نہیں ہے لیکن ادھر کئی اہم تحریریں دستیاب ہوگئی ہیں ان میں سب سے اہم راجہ حسن خاں کی کتھا ہے، جس کو نرسنگھ میو نے نظم کیا تھا۔ نرسنگھ الور ضلع کی تحصیل لکشمن گڑھ کے گاؤں 'کاچھوتا' کا رہنے والا تھا اور اس نے راجہ حسن خاں میواتی کے ساتھ 1526 میں پانی پت کے میدان میں سلطان بابر کے خلاف جنگ میں حصہ لیا تھا۔ اس کتاب میں اسی جنگ کا آنکھوں دیکھا حال لکھا ہے۔ اس کتاب کا ایک مخطوطہ جو 1639 میں لکھا گیا وہ ٹوڈا رائے سنگھ ٹونک کے ایک جین مندر میں محفوظ ہے۔ اس کو ایم پی شرما نے شائع کرادیا ہے لیکن یہ نسخہ مکمل نہیں ہے اس میں 127 چھند ہیں لیکن زبان کا نمونہ بہرحال مل جاتا ہے۔ اس کے علاوہ لال داس میو (1538-1648) کا مجموعۂ کلام شائع ہوگیا ہے۔ اسی طرح میاں راج شاہ میواتی (1799-1889) کے ملفوظات میں میواتی دوہے اور میو شاعروں کا عارفانہ کلام ملتا ہے۔ بعض اور نمونے بھی مطبوعہ شکل میں دستیاب ہیں اور تلاش و جستجو کا یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

۶ مولوی عبدالحق: مکتوباتِ عبدالحق، مرتبہ جلیل قدوائی، مکتبہ اسلوب کراچی، 1963، ص 96۔ خط بنام عبدالستار صدیقی

۷ ایضاً، ص 95

۸ ساغر نظامی (مرتب): روحِ مکاتیب، ماہنامہ ایشیا، میرٹھ، مکاتیب نمبر، حصہ اول، زیرِ سرپرستی ڈاکٹر سیّد محمود۔ اڈیٹر ساغر نظامی، جلد نمبر 6، شمارہ 11، جون 1941، ص 120

۹ ایضاً، ص 122

۱۰ سیّد مطلبی فریدآبادی: شمالی ہند کے دیہاتی شعرا میں جدید انقلابی رجحانات، مشمولہ مجلّہ جامعہ دہلی، زیرِ ادارت ڈاکٹر سیّد عابد حسین، جلد 28 شمارہ 2 اور 3، اگست اور ستمبر 1937

۱۱ مکتوباتِ عبدالحق ص 482، خط بنام ہاشمی فریدآبادی، مورخہ 25 مارچ 1938۔ اتفاق یہ ہے کہ اس خط کے بعد 1946 تک ہاشمی فریدآبادی کے نام باباے اردو کا کوئی خط دستیاب نہیں ہوسکا ورنہ اس سفر کی اور تفصیلات بھی مل سکتی تھیں۔

۱۲ آئی۔ اے۔ رحمان: گنجِ گراں مایہ، مشمولہ ''سیّد مطلبی فریدآبادی''، مرتب میاں محمد اکرم، نیاز مانہ پبلی کیشنز، لاہور 2011، ص 27

...(بقیہ صفحہ 6 پر)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : **گریز پا** (افسانوی مجموعہ)
افسانہ نگار : لالی چودھری
ضخامت : 208 صفحات
قیمت : 350 روپے
ناشر : موڈرن پبلشنگ ہاؤس، 9 گولا مارکیٹ، دریا گنج نئی دہلی-110002
تبصرہ نگار : سعید اختر اعظمی
E-mail: sakthar0075@gmail.com

دیارِ غیر میں رہ کر وطنِ عزیز کی یادوں کا تسلسل قائم رکھنا قلم کار کا اپنے ملک سے حد درجہ لگاؤ کا اظہار ہے۔ یہ ذمے داری یہیں ختم نہیں ہوتی۔ برِصغیر کی یادوں کو سینے سے لگائے وہ لوگ بھی تخلیقی حوالوں کا اعتبار یہ بننے کی اہلیت رکھتے ہیں جو وہاں مقیم ہیں، جو ایک اجنبی تہذیب میں گھرے ہوئے اپنی شناخت قائم کرنے کے لیے کوشاں ہیں، جو وہاں کے طور طریقوں سے ہم آہنگ ہونے کے خواہاں ہیں جہاں قدم قدم پہ سمجھوتے اور مصلحتوں کے خار زار ہیں۔ ایسے میں خود اعتمادی کی بحالی، انفرادی جدوجہد، کھونے پانے کی کشاکش اور کائناتِ نو کی تعمیر کا عزم پھولوں کی سیج ہرگز نہیں بن سکتا۔ اسے موضوعِ گفتگو بنانے والا عمیق مشاہدہ، وسعتِ نظر، تخیل کی گہرائی اور انسانی نفسیات سے واقفیت رکھتا ہے۔ لالی چودھری کا فکشن رنگ اسی پس منظر سے ہم آہنگ ہے۔ انھوں نے کرداروں کی جزئیات کو اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ خود بھی جزوِ لازم بن گئی ہیں۔

'حد چاہیے سزا میں' کے توسط سے اپنی حاضری درج کرانے والی لالی چودھری کا دوسرا فکشن پڑاؤ 'گریزپا' حال ہی میں منظرِ عام پر آیا ہے۔ اس میں شامل ایک درجن افسانوں کی تنوع رنگ کہکشاں قاری کو جہانِ دیگر کی سیر کراتی ہے۔

'سمجھوتے کی صلیب' پہلی نظر کا پیار، قربِ محبوب کی تمنا، ایثار کا کوہِ ہمالہ سر کرنے کا جنون اور آخرش بے سکونی کا عذاب مول لینے کی سزا کو اپنا نصیبہ بنانے والی کا المیہ ہے جس نے خاموشی سے الگ ہو جانے میں عافیت سمجھی۔ 'تھینک گڈنیس' پیشوں کی عظمت کے شانہ بہ شانہ زبانِ افرنگ کی کرشمہ سازیوں کو سامنے لاتی ہے تو 'گڈ وائف سینڈروم' خاوند کے مزاج کے مطابق ڈھل جانے والی سہاگن کی داستان ہے جو مشرقی تہذیب کی پروردہ ہونے کے باوجود مجازی خدا کو خوش کرنے کے لیے مغربیت کی چکا چوندھ میں گم ہونے پہ مجبور ہوگئی۔ 'ماں بیٹی' سرکش اولاد کی بے راہ روی ہے جو ایک ذرا سی بے توجہی سے قعرِ مذلّت میں گرتی چلی گئی۔ 'انتقامِ حروف' اہل و عیال کی خوشگوار زندگی کے لیے لفظوں کا سودا کرنے والے کا کرب ہے جو اپنی شخصی اکائی کی بحالی کے لیے کوشاں ہوا تو قدرت کے انتقام کا شکار ہوگیا۔ 'پنگوڑا گر جائے گا' مہلک مرض کے زیرِ اثر رہ کر قطرہ قطرہ پگھلنے والی اولاد کی روداد ہے جو تسلی بھرے الفاظ کے جواب میں اتنا ہی کہتا کہ وہ ان کے لیے کوئی مسرور کن لمحہ مہیا نہیں کرا سکا۔ ماں باپ کو ساری عمر کاتبِ تقدیر سے شکوہ رہا لیکن وہ اس کے حصے کا درد بانٹنے میں ناکام رہے۔ 'کھٹ مٹھا رشتہ' سجیلے کزن کی تلاش ہے جو ملا بھی تو کسوٹی پہ کھرا نہیں اتر سکا۔ 'گریزِ پا' 'لوگ یوں ہی عادتاً بے وفا نہیں ہوتے' کی عملی تصویر ہے جس میں پُرسکون ازدواجی زندگی گزارنے والی شریکِ حیات کے بحرِ حیات میں ماضی کے محبوب سے مل کر مدوجزر برپا ہوا اور وہ گناہ کی دلدل میں ڈوبتی چلی گئی۔ 'بدلتے مراسم' مظاہرۂ امن کے دوران ملنے والے دو نفوس کی یکجائی ہے جو جنگ و جدال کے خلاف تھے، عجیب اتفاق کہ ان کی زندگی نکتہ چینی کی نذر ہوئی تو الگ ہونے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ باقی نہ رہا۔ دونوں پچھتاوے کی آگ میں جلتے رہے اور ایک دن قدرت ان پہ مہربان ہو ہی گئی۔ 'پا بہ زنجیر' معلّمہ کے زہد و تقدس کا قصرِ فلک بوس ہے جو مسمار ہوا تو اس کے ملبے کی بکھری اینٹیں سمیٹنے کا بھی کوئی روادار نہ رہا۔ 'وان گونو نیز' خودکشی کو غمِ ہستی کا علاج قرار دینے والے نئ عمر کے جوشیلے طالبِ علم کا افسوسناک انجام ہے جو شاید ذرا سی توجہ سے اس اقدام سے باز رہ جاتا۔ 'کوگر' شباب کی دہلیز پار کرنے والی خاتون کا ایک نوجوان کے لیے والہانہ التفات ہے جو انجام سے آگاہی کے بعد اپنے مدار میں واپس آگئی۔

لالی چودھری کے یہ افسانے زبان کی سلاست اور کردار کے فطری پن کے سبب قاری کو متوجہ کرتے ہیں۔ ان کا قوی مشاہدہ اور منفرد اسلوب پڑھنے والے کو اپنے سحر میں باندھے رکھتا ہے۔ بولڈنیس اور فکری آزادی کی لہر میں بہنے والے ان کے کردار عہدِ حاضر کی نئ سوچ اور حدود و قیود سے نجات کے متمنی ہیں، یہ صرف اہالیانِ مغرب کا ہی المیہ نہیں، مشرق میں بھی یہ لہر چل پڑی ہے اور نئ نسل اس ریلے میں بہی چلی جارہی ہے۔ لالی چودھری نے اپنے مشاہدے کو زبان دے کر اسے سپردِ خامہ و قرطاس کر کے اپنی ذمے داری بہ حسن و خوبی نبھانے کی سعی کی ہے اور اس میں وہ خاطر خواہ کامیاب بھی رہی ہیں۔ ◆◆

بقیہ: بابائے اردو مولوی عبدالحق اور میوات

[صفحہ 3 سے آگے]

۱۳۔ مکتوب چودھری شہاب الدین خاں بنام جناب شبیر احمد خاں میواتی (لاہور)۔

۱۴۔ چودھری کنول خاں میوات کے مشہور لیڈر تھے۔ وہ میواتی زبان کے بہترین خطیب تھے ان کی شعلہ بیانی ضرب المثل ہے سیّد مطلبی فرید آبادی اور کمال سالار پوری نے ان کی شعلہ بیانی کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کی وفات کوٹ رادھا کشن (لاہور، پاکستان) میں 27 اپریل 1978 کو ہوئی۔ (پروفیسر محمد اسلم: وفیاتِ مشاہیرِ پاکستان، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1990، ص 202

۱۵۔ مولانا چودھری کمال سالار پوری: میوات کی چند باکمال شخصیات، ادارہ تحقیقاتِ میوات، لاہور 2010، ص 54

۱۶۔ بابائے اردو نے جس شعر کی تعریف کی ہے وہ شعر ایک مختصر ڈرامے کا حصہ ہے۔ میواتی ادب میں ایسے مختصر ڈرامے بہ کثرت ہیں۔ ان ڈراموں میں بالعموم چار یا پانچ یا کچھ زیادہ دوہے ہوتے ہیں اور کچھ نثر ہوتی ہے جس کے سہارے زندگی کی کوئی حقیقت بیان کردی جاتی ہے۔ مذکورہ ڈرامے میں میاں بیوی کے درمیان ایک معمولی بات پر جھگڑا اور بیوی کی عقلمندی سے اس جھگڑے کے تصفیے کا قصہ ہے۔ ڈرامہ یوں ہے کہ ایک عورت اپنے شوہر کے ساتھ ایک چارپائی پر تھی۔ عورت نے اپنے شوہر سے کہا کہ تم ذرا پرے سرک جاؤ چارپائی پر میرے لیے جگہ تنگ ہو رہی ہے۔ اس بات کو دوہے میں اس طرح کہا:

پاٹی ڈوبے کمر میں پڑے بُھجن پہ زور
میں نے توئے کے بر کہی تنک سَرَکیو اور

یعنی چارپائی کی پٹی میری کمر میں چبھ رہی ہے، بازوؤں پر زور پڑ رہا ہے میں نے تم سے کتنی بار کہا ہے کہ ذرا سا پرے سرک جاؤ۔

شوہر کو عورت کا بار بار یہ کہنا ناگوار ہوا۔ وہ اٹھا اور تیار ہو کر گھوڑی پر سوار ہوا اور بھوپال کے پاس ایک شہر ہے مندسور وہاں جا پہنچا اور وہاں سے خط لکھا کہ:

اسّی کوس ملتان ہے دو سو ہے مندسور
اب بھی سیج سخت ہے تو پرے سرک جاؤں اور

یعنی ملتان اسی کوس ہے اور مندسور (بھوپال کی طرف ایک شہر) دو سو کوس ہے (میں اتنے فاصلے پر آگیا ہوں) اگر تمھاری سیج اب بھی تنگ ہے تو اور دور چلا جاؤں۔

اُس عورت نے اس خط کے جواب میں وہ شعر لکھا تھا جس کی بابائے اردو نے بڑی تعریف کی۔

تنک سَرَک تو سو کہی کیا دکھ بیا پو توئے
جیسے بستر تجی بُھجنگ نے تو ایسے تج گو موئے

اس قصے میں دو دوہے اور ہیں لیکن وہ ذرا مبتذل سے ہیں۔ ویسے دیہاتی شاعری میں یہ مرض ہر جگہ ہوتا ہے۔ دل چسپی اور واقعہ کی تکمیل کے لیے وہ بھی درج کیے جاتے ہیں۔ آگے یہ ہوتا ہے کہ جب کافی دن تک نہ شوہر آتا ہے اور نہ ہی اس کا کوئی خط آتا ہے تو وہ عورت خود اپنے شوہر کو خط لکھتی ہے کہ اچھا اب تم اپنی ضد پر رہو اور مت آؤ، میں نے تو یہاں چار شوہر کر لیے۔ اس بات کو دوہے میں اس طرح کہتی ہے:

پہلو ایڈی دابتو دوجو مَسلے انگ
تیجو چومی لیئ تو چوتھو میں لے کے سوؤں سنگ

یعنی میرے چار شوہر ہیں ایک میرے پیچھے پیچھے چلتا ہے، دوسرا میرا بدن دباتا ہے، تیسرا میرے بوسے لیتا ہے اور چوتھا میں اپنے ساتھ لے کر سوتی ہوں۔

شوہر کو یہ خط ملا تو بھاگم بھاگ واپس آیا لیکن اس کو گھر میں بیوی کے علاوہ کوئی نہیں دکھائی دیا تو بیوی سے پوچھا کہ جن کا تم نے ذکر کیا تھا وہ کہاں ہیں۔ بیوی نے ہنس کر جواب دیا کہ وہ تو ہر وقت میرے ساتھ رہتے ہیں:

لہنگو ایڈی دابتو، انگیا مسلے انگ
تُنگی چومی لیئ تی، پاٹی لے کے سوؤں سنگ

یعنی میرا لہنگا میرے پیچھے چلتا ہے، انگیا میرے جسم پہ رہتی ہے، تُنگی (بالوں کی پہلی لٹ جو دونوں رخساروں پر ہوا کے جھونکے سے آتی رہتی ہے اس کو تُنگی کہتے ہیں) میرا بوسہ لیتی ہے اور پاٹی (چارپائی کی پٹی) میں ساتھ لے کر سوتی ہوں۔ تب شوہر کو اطمینان ہوتا ہے۔ ان کا جھگڑا بھی ختم ہو جاتا ہے اور میاں بیوی ہنسی خوشی ساتھ رہنے لگتے ہیں۔

اس طرح یہ ڈرامہ ختم ہو جاتا ہے۔

۱۷۔ مولانا چودھری کمال سالار پوری: میوات کی چند باکمال شخصیات، ادارہ تحقیقاتِ میوات۔ لاہور، 2010، ص 88

۱۸۔ سیّد مطلبی فرید آبادی: پنہاری (میواتی بولی میں منظوم کہانی)، عوامی کتاب گھر، لاہور، 1966، ص 5-7

۱۹۔ ایضاً مذکورہ صفحہ

۲۰۔ سیّد انیس شاہ جیلانی: نوازش نامے، مکتبہ ماحول، کراچی، 1965، مکتوب سیّد ہاشمی فرید آبادی، ص 36

۲۱۔ نواحِ دہلی کی اردو کی دو قدیم ترین کتابیں از ڈاکٹر رشید الدین احمد تجاروی، مشمولہ ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ جنوری 1944، ص 44-48

۲۲۔ اردو کی دو قدیم کتابیں از نصیر الدین ہاشمی، مشمولہ ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ، مارچ 1944 ص 21-220

۲۳۔ اردو کی دو قدیم کتابیں اور ان کا زمانۂ تصنیف از محمد خلیل تجاروی، مشمولہ ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ، جنوری 1945 ص 16-15

۲۴۔ اردو کی دو قدیم کتابیں از ڈاکٹر سیّد نور الحسن ہاشمی، مشمولہ ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ جون 1945، ص 57-156

۲۵۔ رپورٹ میں لکھا ہے کہ جنگ کا خطاب ریاست حیدرآباد کی خصوصیت ہے اس لیے توقع ہے کہ ان بزرگ کا تعلق حیدرآباد سے ہوگا اس لیے نظام حیدرآباد سے درخواست کی گئی تھی کہ اس مقبرے کی دیکھ ریکھ میں تعاون کریں۔ ویسے تاریخی طور پر اس مقبرے کا تعلق حیدرآباد سے نہیں ہے بلکہ یہ عہدِ شاہجہانی کے ایک امیر فتح جنگ کا مقبرہ ہے۔

۲۶۔ جائزہ زبانِ اردو، حصہ اول، مرتبہ انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی، 1940 ص 204-05

۲۷۔ ایضاً، ص 207

۲۸۔ شاہد اکبرآبادی: جلوہ خورشید حرم، کراچی، 1993، ص 378

ڈاکٹر مشتاق احمد تجاروی
اسسٹنٹ پروفیسر، ڈپارٹمنٹ آف اسلامک اسٹڈیز،
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
E-mail: muftimushtak@gmail.com